مولانا سعید الرحمٰن ندوی
ناظم، فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ بنگلور، بھارت

قرآن عظیم اور نظام کائنات

عالم طبیعی کی غیر معمولی وسعت اور خارجی زمینوں کی کثرت پر جدید اعجازی قرآنی بصائر

الحمد لله رب العالمين. والصلاة والسلام على رسوله الكريم. اما بعد:

عصر حاضر میں فلکیاتی میدان میں علم انسانی نے غیر معمولی ترقی حاصل کرلی ہے، جس کی بدولت ہمارا تصور کائنات سرے سے تبدیل ہو چکا ہے۔ صرف ایک صدی قبل تک بھی ایک زمانہ وہ تھا جب کائنات اس قدر محدود و مختصر تھی کہ اس میں ہمارے نظام شمسی اور سادہ آنکھ کو نظر آنے والے مٹھی بھر ستاروں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کائنات میں صرف ایک سورج، ایک زمین اور ایک چاند تھے۔ اور خود سترھویں صدی عیسوی تک بھی زمین اس کائنات کا مرکز ومحور شمار ہوتی رہی تھی۔ مگر بیسویں صدی میں مختلف اقسام کی طاقتور دوربینوں کی ایجاد اور اس کے نصف آخر کی پے در پے خلائی پیش قدمیوں کے باعث اس کائنات کا ایک بالکل دوسرا اور نہایت تابدار چہرہ رونما ہوا، جس کے نتیجے میں ہماری سابقہ کل کائنات ابھرتی ہوئی نئی کائنات کے ناقابل تصور وسیع وعریض اور گہرے سمندر کے مقابلے میں ایک ایسا حقیر سا تنکا نظر آنے لگی جس کی کوئی معنوی حیثیت ہی نہ ہو۔ چنانچہ انسان اس کائنات میں اب تک تقریباً ایک کھرب ایسی کہکشائیں دریافت کر چکا ہے جن میں سے ہر ایک میں ہمارے سورج جیسے یا اس سے بھی کئی گناہ بڑے کئی کھرب مزید سورج ہوتے ہیں۔ خود ہماری ''ملکی وے'' کہکشاں (Milky Way galaxy) جس میں ہماری زمین اور سورج اپنا وجود رکھتے ہیں کوئی چار کھرب دیگر سورجوں کا مجموعہ ہے۔ ملحوظ رہے کہ یہ عدد اس قدر عظیم اور حواس باختہ ہے کہ اگر صرف اسی ایک کہکشاں کے ان سورجوں کو ہماری زمین کے سارے انسانوں میں تقسیم کر دیا جائے تو ان میں سے ہر ایک کے حصے میں کم از کم ساٹھ ایسے سورج آجائیں گے، جن میں سے ہر ایک ہماری زمین سے اوسطاً دس تا پندرہ لاکھ گناہ بڑا ہوتا ہے۔

پورے آسمان میں ہماری سادہ آنکھ کو نظر آنے والے ستارے تقریباً چھ ہزار ہیں، اور وہ سب کے سب خود ہماری کہکشاں میں اپنی اپنی جگہوں کے سورج اور خود ہمارے سورج کے متصل پڑوسی ہیں۔ یہ تمام ستارے ہماری

کہکشاں کے ایک بازو میں واقع ہیں، جو کہ اپنے مرکز سے پچیس ہزار نوری سال کی مسافت پر واقع ہے۔ مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک آسمان کے افق پر یہی چھ ہزار ستارے ہم اپنی سادھی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، جن کے علاوہ کوئی دوسری کہکشاں ہمیں عام طور پر نظر نہیں آتی ہے۔ اس طرح ہمیں جو کچھ نظر آرہا ہے وہ اس محیر العقول وسیع وعریض کائنات در کنار خود ہماری اپنی ایک کہکشاں کا رمق بھر حصہ بھی نہیں ہے۔ بقیہ ساری کائنات ہماری آنکھوں سے پوری طرح اوجھل اور صرف چند نہایت طاقتور دوربینوں کی مدد ہی سے دیکھی یا محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس کائنات کی وسعت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ دور دراز کی کہکشائیں ہماری ہر جانب اربوں نوری سال کی ناقابل تصور دوری پر واقع ہیں۔ ہر کہکشاں کا قطر چند ہزار سے لاکھوں نوری سال کا ہوتا ہے۔ ہر کہکشاں دوسری کہکشاں سے دسیوں لاکھ نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہوتی ہے۔ خود ہماری کہکشاں کے ہر دو ستاروں کے درمیان اوسطاً پانچ نوری سال کا فاصلہ ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ ایک نوری سال کا مطلب چورانوے کھرب ساٹھ ارب (۹۴،۶۰،۰۰،۰۰،۰۰،۰۰۰) کلومیٹر ہوتا ہے۔ ایک نوری سال کی یہ مسافت اس قدر طویل ہوتی ہے کہ اس میں ہماری زمین اور سورج کے درمیان جیسی ترسٹھ ہزار مسافتیں سما سکتی ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ مسافت اس قدر عظیم ہوگی جو کہ تہتر کروڑ زمینیں ایک قطار میں جوڑ دئے جانے کے بعد بنتی ہے۔ جب ایک نوری سال کی مسافت کا یہ عالم ہو تو اربوں نوری سال کی کائناتی وسعت کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

موجودہ کائنات کی اس بیکراں وسعت کا اندازہ بیسویں صدی میں دوربین کی ایجاد کے بعد ہی ممکن ہوسکا ہے۔ فلکیاتی سائنس اب اس بات کا پتہ لگانے میں اپنا پورا زور صرف کررہی کہ اس وسیع وعریض کائنات میں کیا ہے؟ کیا ہماری کہکشاں یا دیگر کہکشاؤں میں ہمارے نظام شمسی کے مانند اور بھی نظامہائے شمسی کا وجود ہے؟ اگر ہے تو کیا ان میں ہماری زمین جیسی قابل رہائش اور بھی زمینیں ہونگی؟ اگر ہونگی تو کیا ان میں زندگی یا عقلمند زندگی بھی ہوگی؟ زندگی کی نوعیت کیا ہوگی؟ کیا انسان کائنات کے صرف اسی گوشے اور ہماری کہکشاں کے انہیں ''گمنام'' مضافات میں ہے یا دیگر مقامات پر بھی ہوسکتا ہے؟

فلکیاتی سائنس کے لئے اب تک کا راستہ نسبتاً آسان تھا۔ اس کائنات کی وسعتوں اور جلی صداقتوں کا پتہ علمی واستدلالی اور تجرباتی ومشاہداتی طور پر زمین بیٹھے اجرام سماوی سے خارج ہونے والی برقی مقناطیسی شعاعوں (electromagnetic radiations) کے تجزیے ومطالعے اور مختلف حسابی اصولوں (mathematical equations) کی بنا پر اسے زیادہ مشکل ثابت نہ ہوسکا۔ مگر اسے اصل دشواری اس کائنات کی دیگر زمینوں کی تحقیق وتفتیش اور ان میں زندگی کے وجود کا پتہ لگانے میں پیش آرہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ راہ بڑی دقت طلب اور دشوار گزار ہے۔ فلکیاتی سائنس اس سمت میں اپنے حدود وقیود سے اچھی طرح واقف ہے۔ خارجی زمینوں کی دریافت

اوران میں زندگی کے وجود کا پتہ لگانے کے لئے انسان کا جسمانی طور پر ہمارے نظام شمسی سے باہر نکل کر صرف اپنے قریب ترین ستارے ہی تک پہنچنا تقریباً ناممکن نظر آرہا ہے۔ واضح رہے کہ یہ قریب ترین ستارہ ہم سے کوئی سوا چار نوری سال یعنی چار سو کھرب کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے، جہاں پہنچنے کے لئے آج انسان کے پاس دستیاب سب سے تیز رفتار راکٹ کو لگ بھگ ساٹھ ہزار سال لگ جائیں گے۔ یہ مسافت تو غیر معمولی طور پر نہایت طویل ہے، خود ہمارے نظام شمسی میں موجود صرف پانچ کروڑ کلومیٹر دور ہمارے پڑوسی مریخ تک بھی انسان اب تک رسائی حاصل نہیں کر سکا ہے۔ جن طاقتور دوربینوں کو استعمال میں لاکر انسان نے اربوں نوری سال کے فاصلے پر موجود کہکشاؤں اور دیگر اجرام سماوی کا مشاہدہ ومطالعہ کر کے ان کی حقیقی تصاویر تک اتار چکا ہے وہی دوربینیں انتہائی قریبی ستاروں کے اطراف واکناف گردش کر رہے سیاروں کو اپنی گرفت میں لے آنے سے بری طرح قاصر رہی ہیں، کیونکہ ان سیاروں سے خارج ہونے والی روشنی یا دیگر برقی مقناطیسی شعاعیں اپنے مراکز ستاروں سے سیکڑوں کھرب گناہ ہلکی اور کمزور ہونے کی وجہ سے ان دوربینوں کی گرفت میں نہیں آسکتی ہیں۔ اس میدان میں بصری دوربین (optical telescope) کچھ بھی کام نہیں آسکی ہے۔ البتہ جدید فلکیات نے دیگر بالواسطہ تکنیکی ذرائع سے بھی اور ایک بالکل ہی الگ نوعیت کی اور نسبتاً زیادہ مفید وکارآمد زیریں سرخ اشعاعی دوربین (infrared telescope) کی مدد سے بھی-- جو اجرام سماوی سے خارج ہونے والی زیریں سرخ شعاؤں (infrared rays) کی مدد سے ان اجرام کا حقیقی عکس کمپیوٹر پر اتار دیتی ہے-- ہماری کہکشاں میں سن ۲۰۰۲ء تک ستر ایسے نظام ہائے شمسی دریافت کر لئے ہیں جو کہ ہمارے سورج کے اردگرد کوئی ڈھائی سو نوری سال کی مسافت کے اندرون میں واقع ہیں۔ تحقیق وتفتیش کا یہ سلسلہ پوری آب وتاب کے ساتھ ہنوز جاری ہے، اور موجودہ دوربینوں کو مزید طاقتور بھی بنایا جارہا ہے تاکہ کائنات کا مطالعہ مزید باریکی سے کیا جاسکے۔ نتیجتاً مسلسل ہر تھوڑے وقفے سے نئے نئے نظام ہائے شمسی دریافت ہوتے بھی جارہے ہیں۔ اور معلوم نہیں کہ یہ کتاب طبع ہو کر قارئین کے ہاتھوں پہنچنے تک ان کے عدد میں کس قدر اضافہ ہو جائے۔ اس وقت خصوصیت کے ساتھ یاد رہے کہ سب سے پہلی خارجی زمین آج سے صرف گیارہ سال قبل ۱۹۹۶ء ہی میں دریافت ہوسکی ہے۔ ہمارے پڑوس کے ان ستر نظام ہائے شمسی کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان میں موجود ہمارے مشتری جیسے (یاد رہے کہ مشتری ہماری زمین سے ۳۱۸ گناہ ضخیم ہے) یا اس سے بھی کئی گناہ بڑے دوسو سے کچھ زائد سیارے تو دریافت ہو گئے مگر نسبتاً چھوٹے اور خورد سیارے ابھی ہماری گرفت میں نہیں آسکے ہیں۔

چنانچہ فلکیاتی سائنس اب یہ پتہ لگانے کی سمت میں کوشاں ہے کہ ان میں ہمارے نظام شمسی کے زمینی سیاروں کے مانند کون سے سیارے ہوسکتے ہیں، تاکہ وہاں زندگی کو تلاش کیا جاسکے۔ اس وقت خارجی زندگی کی تلاش کے لئے ایک علاحدہ منصوبہ ''تفتیش برائے خارج از زمین عاقل زندگی'' (Search for Extraterrestrial

SETI -- Intelligence) کے تحت ایسے چالیس متوقع زمینی سیاروں اور ان میں بسی ممکنہ عقلمند تہذیبوں سے مصنوعی ریڈیائی لہروں (artificial radio waves) کے ذریعے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جو ہم سے ہر طرف ۸۰ نوری سال کے فاصلہ کے اندر واقع ہیں۔ دنیا بھر میں قائم مختلف سائنسی ادارے بھی اپنے اپنے انفرادی منصوبوں کے تحت ٹھیک اسی کھوج میں لگے ہیں۔ فی الحال سائنس کے پاس خارجی زندگی کی تلاش کا یہی ایک مؤثر ذریعہ رہ گیا ہے۔ مگر یہ راستہ بھی کافی طویل اور نہایت صبر آزمہ ہے۔ مثال کے طور پر اگر آج ہم نے بارہ نوری سال کے فاصلے پر واقع ایک ستارے ''تاؤ سیٹی'' (Tau Ceti) کی ہماری جیسی ایک متوقع زمین سے (جس سے اس وقت SETI منصوبے کے تحت واقعتاً رابطہ پیدا بھی کیا جارہا ہے) رابطہ قائم کرنے کی غرض سے ریڈیائی شعاعوں کے ذریعے کوئی سگنل بھیجا تو یہ سگنل نشانے پر پہنچتے پہنچتے ٹھیک بارہ سال گزر جائیں گے۔ پھر ہمارے اس سگنل کو وصول کرنے کے لئے اگر وہاں پر کوئی مخلوق موجود ہو، ترقی یافتہ ہو، سگنل کو سمجھ بھی سکتی ہو اور فوری جواب دے دے تو اس جوابی سگنل کو واپس ہم تک پہنچنے کے لئے مزید بارہ سال درکار ہوں گے؛ یعنی صرف علیک سلیک ہی میں پورے چوبیس سال گزر جائیں گے۔ لہذا آج آسانی کی خاطر SETI کے تحت تقریباً ساری جدوجہد خارجی تہذیبوں کو ہمارے سگنل بھیجنے کے بجائے ممکنہ طور پر ان کے بھیجے گئے سگنلوں کو حاصل کر کے انہیں سننے اور سمجھنے ہی میں صرف کی جارہی ہے۔ یہ سب کچھ اس امکان واحتمال کی بنیاد پر ہورہا ہے کہ ہمارے اطراف واکناف کی ممکنہ خارجی مخلوقات تہذیبی وتمدنی طور پر اور سائنس وتکنالوجی کے میدان میں ہم سے بہت زیادہ فائق اور بین سیاراتی مواصلات (interstellar communications) میں ہم سے زیادہ تجربہ کار ہونگی۔ مگر اس وقت یہ بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بقول ایک سائنسدان یہ عمل اس بوتل کی تلاش کے مترادف ہوگا جس میں کوئی سگنل بند کر کے ایک عرصہ قبل ہی ایک گہرے سمندر میں کہیں پھینک دیا گیا ہو۔ لہذا سائنس اس ضمن میں اب تک کسی بھی خاطر خواہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکی ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ اگر پچھلی چار دہائیوں سے اس دوڑ میں شامل اور مغربی حکومتوں کی مالی امداد پر قائم کچھ نامور اداروں نے نہایت مایوسی کا شکار ہو کر اپنے اپنے منصوبوں کو پوری طرح خیر باد کہہ دیا ہے تو کچھ اور جن میں چند غیر سرکاری تنظیمیں بھی شامل ہیں اس کوشش کو اس امید پر جاری رکھے ہوئے ہیں کہ ایک نہ ایک دن کامیابی ان کے قدم ضرور چومے گی۔

یہ ہوئی عملی میدان میں خارجی زمینوں اور ان میں زندگی کی جسمانی طور پر تلاش وجستجو کی بات۔ مگر جدید فلکیات نے علمی واستدلالی سطح پر ان کے ممکنہ وجود کے سلسلے میں کافی پیش رفت حاصل کر لی ہے، اور بہت سارے وزنی اور ناقابل تردید دلائل وشواہد فراہم کر لئے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس نے کائنات میں ہر جانب آگ سے پھیلے دھوئیں کو تو دریافت کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے، مگر ابھی خود نفس آگ کو کھوج نکالنا باقی ہے۔ اور موجودہ تناظر میں لگتا بھی یہی ہے کہ ہم خارجی مخلوقات کے وجود پر ٹھوس علمی وعقلی شہادتوں کے ذریعے صرف استدلال ہی کر سکتے ہیں، اور جسمانی

طور پر انہیں ڈھونڈ نکالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہی ہوگا۔ اس ضمن میں فلکیات کے نزدیک سب سے بڑا اور نہایت بنیادی سوال یہ ہے کہ انسان اس محیر العقول وسیع وعریض اربوں سالہ قدیم کائنات کی ایک معمولی کہکشاں کے مضافات میں ایک معمولی ستارے کے ایک حقیر سیارے ہی میں اور پچھلے چند ہزار سال ہی سے آباد کیوں ہے، جسے نہ خود اپنے نظام شمسی میں مرکزیت حاصل ہے اور نہ ہی اپنی کہکشاں میں، اور یہ کہ یہ یہاں کہاں سے آیا ہے؟

اس مسئلے کو سلجھانے کی سمت میں فلکیات کو کچھ اسباق وبصائر خود ہمارے نظام شمسی ہی سے فراہم ہوگئے ہیں۔ چنانچہ اس کے ابتدائی چار سیاروں--عطارد، زہرہ، زمین اور مریخ--کو زمینی سیارے (terrestrial planets) یا عرف عام میں صرف زمینیں ہی کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کی بنیادی ساخت وپرداخت چٹانوں سے ہوئی ہے (آج انسان کو کائنات میں اسی طرح کی چٹانی زمینوں کی تلاش ہے، جس میں وہ اب تک ناکام رہی ہے)۔ ان میں بالخصوص مریخ ہماری زمین سے سب سے زیادہ مشابہ لگا ہے۔ انسان اس کا مطالعہ مزید گہرائی وگیرائی سے کرنے کی غرض سے اس کی فضا میں اور اس کی سطح پر متعدد خلائی مشن روانہ کر چکا ہے، اور آئے دن کرتا بھی جارہا ہے۔ لہٰذا سائنس کو یہاں بالواسطہ طور پر اربوں سال قدیم زندگی کے کچھ نہایت ہی معنی خیز آثار وشواہد بھی ملے ہیں۔ چنانچہ وہاں ماضی میں زندگی کے لئے سب سے اہم شئے سطحی سیال پانی کی فراوانی تھی، جو زیر سطح منجمد اور ٹھوس حالت میں آج بھی موجود ہے۔ پانی کے وجود سے زندگی کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ کرۂ ہوا ہلکی مقدار میں آج بھی موجود ہے، جس سے مستنبط ہوتا ہے کہ سطحی پانی کی موجودگی میں وہ کثیف رہا تھا۔ سائنس اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہ رہی ہے کہ سابق میں جب بھی حالات سازگار رہے ہوں وہاں زندگی کا وجود کسی نہ کسی شکل میں ضرور رہا ہوگا، جو بعد کے ناسازگار ماحول کی وجہ سے ختم ہو چکا ہو۔ اگر یہ استدلال درست ہو تو پھر زندگی کو صرف ہماری زمین ہی سے جوڑے رکھنے کے کوئی معنے نہیں رہ جائیں گے۔ مگر اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا ہے کہ وہاں کی زندگی بھی خود ہماری طرح ہی کی رہی ہو۔ جب بات اس طرح بن سکتی ہے تو اس سے ایک وسیع پیمانے پر یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس کائنات میں جہاں کہیں بھی ہماری جیسی زمین ہو اور وہاں زندگی کے بنیادی لوازمات بھی میسر ہوں وہاں زندگی ہوسکتی ہے۔ مگر اس کے لئے سائنس فی الحال زندگی کے بنیادی لوازمات کو وہی لوازمات تصور کر رہی ہے جنہیں وہ اس زمین کے پس منظر میں ماننے پر مجبور ہے۔ ورنہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہم یہاں جن اشیاء کو زندگی کے بنیادی لوازمات میں شامل کریں وہ دوسری زمینوں میں بھی ٹھیک وہی ہوں۔ اگر یہاں پر زندگی کے لئے کاربن، آکسیجن اور نائٹروجن ضروری ہوں تو ہوسکتا ہے کہ دوسری زمینوں پر کوئی دوسرے عناصر ناگزیر ہو جائیں۔ ان خطوط پر ظن وتخمین کے بعد جدید فلکیات کے نزدیک صرف ہماری ایک کہکشاں میں ہم جیسی زمینوں اور ان میں بسی ذی عقل وشعور تہذیبوں کی تعداد ایک کروڑ بھی ہوسکتی ہے! مگر بہت سے سائنسدان ایسے بھی ہیں جو موجودہ ساری کائنات میں صرف ہماری موجودہ ایک زمین ہی کو زندگی کا گہوارہ سمجھنے اور موجودہ انسان کو اس

کا اکیلا وارث تصور کرنے پر مجبور ہیں۔ اوران کے اس طرز فکر کو پروان چڑھانے والی سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ اس ضمن میں اتنی ساری کوششوں کے باوجود انسان نے اب تک اس کائنات میں ہماری زمین کے خارج میں ایک جرثومہء حیات تک بھی کھوج نہیں سکا ہے، نہ زندہ اور نہ ہی مردہ۔ چنانچہ قابل بود و باش زمینوں اوران میں بسی ممکنہ تہذیبوں کی تعداد میں اسقدر کمی وبیشی اس میدان میں انتہائی امید افزا اور نہایت مایوس کن تخمینوں کا مظہر ہے۔ اب اگر ایک متوسط کہکشاں کا یہ حال ہو تو اس پر اس کائنات کی دیگر ایک کھرب معلوم کہکشاؤں کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں دنیائے سائنس میں ہماری معلوم و مرئی کائنات جیسی متعدد دیگر نامعلوم و غیر مرئی کائناتوں کے وجود پر بھی قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں، اوراس ضمن میں علمی و عقلی دلائل و براہین جمع بھی ہو رہے ہیں۔

موجودہ کائنات کی وسعت، زمینوں کی کثرت اور ممکنہ طور پر ان میں بسی عقلمند تہذیبوں کے ضمن میں یہ تھے سائنسی تجربات و مشاہدات پر مبنی کچھ حقائق اور مفروضات جنہیں ہم نے نہایت درجہ اختصار کے ساتھ سمیٹا ہے۔ اب ذہنوں میں اس سوال کا ابھرنا عین فطری اور مطابق عقل و منطق ہوگا کہ دین اسلام جو دین فطرت اور اس کا نوشتہء ہدایت جو صحیفہء فطرت بھی ہے اس ضمن میں ہماری راہنمائی کس طرح کر سکتے ہیں۔ خود اسی صحیفہء فطرت کے مطابق جب موجودہ پوری کائنات کی تخلیق خود انسان کی ابتلا و آزمائش ہی کے لئے کی گئی ہے، اور جب کائنات کا سابقہ محدود مفہوم آج یکسر تبدیل ہو چکا ہے تو عقل صحیح و فہم سلیم کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اس مسئلے کا حل بھی اسی منبع حکمت و ہدایت میں ہونا چاہئے۔ یہ سوال اس وقت ناگزیر اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے جب یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق فطرت و شریعت دونوں کا سرچشمہ ذات باریٔ تعالیٰ ہی ہے۔ اگر پہلا فعل الٰہی ہے تو دوسرا قول الٰہی۔ دونوں میں کامل تطبیق و ہم آہنگی کا وفور پایا جاتا ہے۔ مزید برآں خود قول الٰہی کا اپنا دعویٰ بھی ہے کہ وہ علم و دانش سے لبریز، ہر مسئلے کی خوب خوب توضیح و تشریح کرنے والی اور ہر چیز کی پوری تفصیل بیان کرنے والی کتاب ہدایت و رحمت اور خوشخبری ہے:

﴿وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ (اعراف: ۵۲)

ترجمہ: ہم نے ان کے پاس ایک ایسی کتاب پہنچادی ہے جسے ہم نے علمی سطح پر خوب کھول دیا ہے، اس حال میں کہ وہ ایمان لے آنے والوں کے لئے ہدایت و رحمت ہے۔

﴿... وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾ (نحل: ۸۹)

ترجمہ: ہم نے آپ پر وہ کتاب نازل کی ہے جو ہر چیز کی خوب وضاحت کرنے والی ہے، اور مسلمانوں کے لئے ہدایت، رحمت اور خوشخبری بھی۔

﴿أَفَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا...﴾ (انعام: ۱۱۴)

ترجمہ: کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو حکم مان لوں، حالانکہ اسی نے تم پر بہت تفصیل کے ساتھ کتاب نازل فرمائی ہے؟

ان صریح آیات کا تقاضہ ہے، بلکہ تفسیر اور قرآن فہمی کا اولین اور مرکزی و بنیادی اصول بھی یہی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ علوم وفنون میں ترقی اور تہذیب وتمدن میں پیش قدمی کی بدولت امت مسلمہ کو پیش آنے والے ہر نئے مسئلے کا حل اور فکر ونظر کے ہر نئے قضیے میں در پیش ربانی ہدایت کو ہم سب سے پہلے خود اسی کے صحیفہ ہدایت میں تلاش کریں۔ اور اگر وہ حل اور خدائی راہنمائی کسی زمانے میں خود ہمارے پس منظر میں اور ہماری اپنی محدود علمی کی بنا اس میں نہ مل سکے تو شریعت اسلامی کے دیگر مصادر ومراجع کی جانب یکے بعد دیگرے رجوع کیا جانا چاہئے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن روانہ کرتے وقت تاکید کے ساتھ اسی ترتیب کی تلقین وتحسین فرمائی تھی، اور خود طبقہ مفسرین اور ائمہ اربعہ کا عمل اور دور اول ہی سے امت کا اجماع واتفاق اسی درجہ بندی پر رہا ہے۔ اس وقت خصوصیت کے ساتھ یہ حقیقت بھی خوب ذہن نشین رہے کہ کائناتی وفلکیاتی تناظر میں اب تک ہمارا فہم قرآن قدیم علوم وفنون اور اکثر وبیشتر قدیم یونانی فلسفے ہی پر مبنی اور ان سے کسی بھی طرح مختلف نہیں تھا، جس میں موجودہ کل کائنات میں سورج، چاند اور زمینوں کی تعداد صرف ایک ایک ہی تھی۔ لہذا اب بغیر کسی مزید تاخیر یا طویل مقدمہ باندھنے کہ ہم راست طور پر قرآن حکیم کے محکم ارشادات اور منصوص بیانات کا جائزہ لے کر دیکھیں گے کہ وہ اس میدان میں ہماری ہدایت وراہنمائی کس طرح کرتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کا ایک مرکزی وریئسی اور نہایت دوررس ارشاد باریٔ تعالیٰ اس طرح ہے:

۱- ﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ، وَالْأَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ، سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ (زمر:۶۷)

ترجمہ: انہوں نے اللہ کی قدر اس طرح نہیں کی جس طرح سے اس کا حق ہے، حالانکہ (اس کی عظمت کا حال یہ ہے کہ) قیامت کے دن ساری زمینیں اس کی مٹھی میں ہونگی اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہونگے، وہ ان لوگوں کے شرک سے پاک اور برتر ہے۔

زمینوں کی کثرت پر یہ ایک منصوص اور نہایت واضح قرآنی بیان ہے۔ اس آیت کریمہ میں ﴿الْأَرْضُ﴾ کی تاکید کے لئے لایا گیا لفظ ﴿جَمِيْعًا﴾ صرف صیغہ جمع ہی پر جچتا ہے، جس سے اس کے مؤکد میں جمع کے معنے پیدا ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں ﴿الْأَرْضُ﴾ کا استعمال بطور اسم جنس ہی ہوا ہے۔ نیز ہمارے اس نقطہ نظر کو تقویت پہنچانے والی ایک دوسری دلیل یہاں ﴿الْأَرْضُ﴾ کا استعمال ﴿السَّمٰوٰتُ﴾ کے سیاق میں ہونا بھی ہے، جس پر گفتگو اسی باب میں کچھ آگے آرہی ہے۔ چنانچہ اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے زمانہ قدیم ہی سے کبار مفسرین کی ایک بہت بڑی جمعیت زمینوں کے ایک سے زائد ہونے کی قائل رہی ہے، جن میں پیش پیش صاحب تفسیر کشاف علامہ زمخشریؒ (متوفی ۵۳۸ھ)، صاحب تفسیر کبیر امام رازیؒ (م ۶۰۶ھ)، صاحب تفسیر الجامع لاحکام

القرآن امام قرطبیؒ (م ۶۷۱ھ)، صاحب تفسیر مدارک التنزیل امام نسفیؒ (م ۷۰۱ھ)، صاحب تفسیر انوار التنزیل واسرار التاویل قاضی بیضاویؒ (م ۷۹۱ھ)، صاحب تفسیر روح المعانی علامہ آلوسیؒ (م ۱۲۷۰ھ) وغیرہ جیسے مفسرین عظام شامل ہیں۔ نیز نقل وروایت کے نامور مفسرین صاحب تفسیر جامع البیان امام طبریؒ (م ۳۱۰ھ)، صاحب تفسیر معالم التنزیل امام بغویؒ (م ۵۱۶ھ)، صاحب تفسیر القرآن العظیم حافظ ابن کثیرؒ (م ۷۷۴ھ)، صاحب تفسیر درمنثور امام سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) وغیرہ نے بھی اس کی تائید میں متعدد احادیث مبارکہ اپنی اپنی تفاسیر میں نقل فرمائی ہیں۔ اسی طرح برصغیر کے ممتاز مفسرین میں صاحب تفسیر مظہری قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (م ۱۲۲۵ھ) نے بھی یہاں زمینوں کا تعدد مراد لیا ہے۔ اگرچہ ہندوپاک کے دیگر مفسرین ومترجمین قرآن بھی زمینوں کی کثرت کے قائل رہے ہیں مگر حیرت انگیز طور پر ان کا استدلال اس آیت کریمہ سے نہیں ہے۔ البتہ وہ اس پر سورۂ طلاق کی آیت نمبر ۱۲ سے استشہاد کرتے ہیں، جس پر تفصیلی گفتگو ہم آگے کرنے والے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بجز اکا دُکا مترجمین کے کسی نے بھی نہ یہاں اور نہ قرآن مجید میں کہیں اور کم از کم بصیغہ جمع ''زمینوں'' ہی کا ترجمہ کیا ہے۔

نیز زمینوں کی کثرت پر دلالت کرنے کے لئے بطور تاکید ﴿جَمِيْعًا﴾ کے استعمال کی کچھ اور مثالیں بھی آگے حسب موقع ومحل پیش کی جائیں گی، جس سے ہمارا موجودہ استدلال مزید قوت وطاقت حاصل کرتا جائے گا۔ چنانچہ حسب ذیل آیت کریمہ بھی ان کی کثرت پر ایک اور اہم دلیل فراہم کرنے والی ہے:

۲- ﴿قُلْ أَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ أَرُوْنِىْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِى السَّمٰوٰتِ...﴾ (احقاف:۴)

ترجمہ: آپ ان سے کہئے ذرا بتاؤ تو سہی اللہ کے ماسوا جنہیں تم پکارتے ہو مجھے دکھاؤ کہ انہوں نے کونسی زمین پیدا کی ہے، یا آسمانوں ہی میں ان کی کونسی حصہ داری ہے؟

یہاں واقع ہونے والا دوسرا ﴿مِنْ﴾ بیانیہ ہے، جو اپنے مبہم ماقبل کی تفسیر کے لئے آتا ہے۔ چنانچہ یہ تعبیر اسی وقت استعمال کی جاتی ہے جب زمینیں ایک سے زائد ہوں۔ اس مفہوم کو مزید تائید وتقویت خود اس کے سیاق وسباق دونوں سے بھی بخوبی حاصل ہو رہی ہے، کیونکہ اس کا وقوع آسمانوں پر مربوط کلام کے بیچوں بیچ ہوا ہے۔ جیسا کہ پچھلے شمارے کے تحت بھی عرض کیا جا چکا ہے ہم اس نکتے پر خاطر خواہ گفتگو آگے اسی باب میں کرنے والے ہیں۔ چنانچہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک اور مرتبہ یہاں بھی ﴿الْأَرْضُ﴾ کا استعمال اسم جنس ہی کے طور پر ہوا ہے۔ لہٰذا زمینوں کے تعدد پر یہ ایک اور صریح قرآنی بیان ہوا۔

اب جب کہ کائنات میں زمینوں کی کثرت ایک سے زائد قرآنی بیانات کے ذریعے، بغیر کسی تاویل کے، نہایت واضح الفاظ میں اور منصوص طور پر ثابت ہو رہی ہے تو ہمارا اگلا سوال یہ ہوگا کہ ان کی حقیقی تعداد کیا ہوگی؟ لہٰذا

شمارہ نمبر ایک سے استشہاد کرتے ہوئے جن مفسرین کرام نے زمینوں کی کثرت مراد لی ہے انہوں نے ان کی تعداد سات قرار دی ہے۔اس عدد تک پہنچنے کے لئے اگر ان مفسرین کے اہل عقل و درایت طبقے نے اپنے اپنے ادوار کے عقلی علوم کی روشنی میں قرآن مجید کی مذکورۂ بالا سورۂ طلاق والی آیت سے استدلال کیا ہے تو اہل نقل و روایت طبقے کے پاس کچھ آثار و روایات بھی موجود ہیں۔مگر متاخرین میں علامہ آلوسیؒ جیسے نامور کچھ مفسرین ایسے بھی گزرے ہیں جن کے مطابق سات کا عدد تام ہونے کی وجہ سے زیادہ کی نفی نہیں بلکہ محض کثرت پر دلالت کرنے والا ہے، لہٰذا آسمان اور زمینیں دونوں سات سے زائد بھی ہو سکتے ہیں۔

اس وقت یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ جہاں تک آسمانوں کی حقیقی تعداد کا تعلق ہے قرآن مجید میں ان کے سات ہونے کا نہایت واضح بیان ایک دو جگہ نہیں بلکہ مکرر طور پر سات الگ الگ مقامات پر بھی آیا ہے، جب کہ اس میں زمینوں کے تعلق سے اس طرح کے کسی بھی معین عدد کا تذکرہ کہیں بھی نہیں کیا گیا ہے، اور نہ ﴿السَّمٰوٰتُ﴾ ہی کی طرح بصیغۂ جمع کہیں ایک مقام پر بھی ''اَلْاَرْضُوْنَ'' کا استعمال ہوا ہے۔لہٰذا اب ہم اس سلسلے کے سارے قرآنی بیانات کا از سرنو جائزہ لے کر کائنات میں زمینوں کی حقیقی تعداد کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔چنانچہ قرآن حکیم ایک موقع سے موجودہ کائنات کی تصویر کشی نہایت اعجازی انداز میں اس طرح کرتا ہے:

۳- ﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا﴾ (فرقان:۶۱)

ترجمہ: بڑا ہی بابرکت ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے، اور ان میں چراغ اور نورانی چاند۔

یہاں سورج کو بطور کنایہ ﴿سِرٰجٌ﴾ (چراغ) کہا جا رہا ہے، جیسا کہ ایک اور موقع سے خود اول الذکر کو آخر الذکر سے تشبیہ بھی دی گئی ہے:

﴿وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا﴾ (نوح:۱۶)

ترجمہ: اس نے سورج کو چراغ بنایا ہے۔

نیز ﴿فِیْهَا﴾ میں موجود ضمیر واحد مؤنث غائب ﴿بُرُوْجٌ﴾ کی جانب ہی لوٹ رہی ہے، کیونکہ ضمیر کا اپنے قریب ترین مرجع کی جانب لوٹایا جانا واجب ہوتا ہے۔اگر اس کا مرجع ﴿السَّمَآءُ﴾ مانا جائے تو اس سے بغیر کسی دلیل کے حقیقی اور راجح مفہوم کے عوض مجازی اور مرجوح مفہوم اپنانے کا ارتکاب لازم آئے گا، جس کا شرعی اعتبار سے کوئی بھی جواز نہیں۔نیز اس صورت میں موجودہ ترکیب ہی بے معنی رہ جائے گی۔کیونکہ اگر بات ایسی ہی ہوتی تو آیت کریمہ براہ راست ''جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّسِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا'' ہوتی۔متقدمین میں خصوصیت کے ساتھ امام رازیؒ نے بھی اسی توجیہ کو اولیٰ و افضل قرار دیا ہے۔ہمارے اس نقطۂ نظر کی مزید تائید حسب ذیل دو اور آیات کریمہ سے بھی بخوبی ہو رہی ہے، جہاں آسمان کی بنیادی تقسیم ہی برجوں سے کئے جانے کا بیان ہو رہا ہے:

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ﴾ (بروج:۱)

ترجمہ: برجوں والے آسمان کی قسم۔

﴿وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَیَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِیْنَ﴾ (حجر:۱۶)

ترجمہ: یقیناً ہم نے آسمان میں برج بنادئے ہیں، اور ناظرین کے لئے اسے آراستہ بھی کر دیا ہے۔

موجودہ آیت میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے کہ ﴿زَیَّنّٰهَا﴾ میں موجود ضمیر واحد مؤنث غائب زیر بحث آیت کے برعکس اپنے مرجع اقرب ﴿بُرُوْجٌ﴾ کے بجائے مرجع بعید ﴿السَّمَآءُ﴾ کی جانب لوٹنے والی ہے، کیونکہ اس کی دلیل یہ ہے کہ کسی چیز کو مزین خود اسی سے نہیں بلکہ اس سے کسی اور کو کیا جاتا ہے۔ نیز اس عقلی استدلال کے بعد اس کی ایک نقلی دلیل خود اس کی متصل اگلی ہی آیت میں ﴿حَفِظْنٰهَا﴾ میں بھی موجود اسی ضمیر واحد مؤنث غائب کا ﴿السَّمَآءُ﴾ ہی کی جانب لوٹنا ہے۔ جب ایک ہی نوع کی دو ضمائر بغیر کسی فصل کے یکے بعد دیگرے واقع ہو رہی ہوں تو ان دونوں کا مرجع صرف ایک ہی ہوسکتا ہے۔ جب کہ زیر بحث آیت میں اس طرح کی کوئی بھی دلیل موجود نہیں ہے۔ لہذا اس ضمیر کے اپنے حقیقی مرجع کی طرف لوٹائے جانے سے اب آیت کے معنے یہ ہوئے کہ اللہ نے آسمان میں برج بنائے ہیں، اور ان برجوں میں سورج اور چاند۔ اس طرح ہمارے آسمان کی دوگانہ تقسیم ثابت ہوجاتی ہے: پہلی اس کا برجوں سے منقسم ہونا، اور دوسری ان برجوں کا چاند اور سورج پر مشتمل ہونا۔ اب اس تقسیم سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ برج کیا چیز ہیں جن میں سورج اور چاند ہوتے ہوں؟

چنانچہ ﴿بُرُوْجٌ﴾ "بُرْجٌ" کی جمع ہے، جس کے حقیقی معنے "محل یا قلعے" کے آتے ہیں۔ یہ لفظ "بَرَجَ، یَبْرُجُ" سے مشتق ہے، جس کے معنے ظاہر اور بلند ہونے کے آتے ہیں، اور "تَبَرُّجٌ" اپنا حسن و جمال دوسروں پر ظاہر کرنے کو کہا جاتا ہے۔ مگر یہاں اس کے اصطلاحی معنے کی تعیین میں زمانہ قدیم ہی سے بڑا اختلاف چلا آیا ہے۔ امام رازیؒ کی تحقیق کے مطابق اس میں حسب ذیل تین اقوال ہیں: مشہور بارہ آسمانی برج، چاند کے منازل اور بڑے بڑے ستارے۔ اب ظاہر ہے کہ جدید علمی وفلکیاتی دور میں چاند اور سورج کی گردش، ان کے مستقر کی تحقیق، سیاروں اور ستاروں کی حقیقت، ان کی گروہ بندیاں، کائنات کی بنیادی ساخت و پرداخت اور اس کی بے پناہ وسعت کے تجرباتی ومشاہداتی سطح پر ظہور کے بعد ان میں سے آخری دو اقوال اپنی معنویت پوری طرح کھو چکے ہیں اور خود زیر بحث آیت ہی میں مذکور ضمیر واحد مؤنث غائب کو اپنے حقیقی مرجع کی جانب لوٹائے جانے کے نتیجے میں بھی یہ دونوں اقوال مرجوح ومفضول ہی ٹھہرتے ہیں، کیونکہ چاند اور سورج کے مستقر نہ چاند کے منازل ہوتے ہیں اور نہ ہی بڑے بڑے ستارے۔

(جاری ہے)